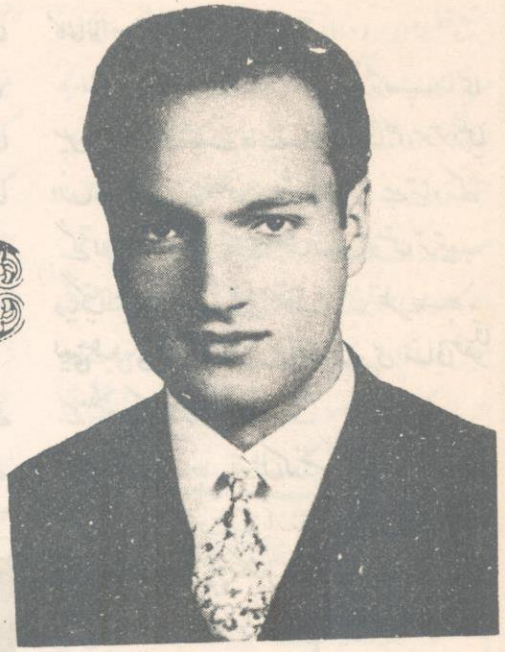

مشین اپنے نظام کی قید میں

از: ڈاکٹر علی شریعتی

دسویں قسط

مشین کی کوئی خصوصیت بیان کیجیے۔ یہ اصالت (ORIGINALITY) کو منفی کرتی ہے۔ اصالت فی الواقع کیا چیز ہے؟ یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ابن بطوطہ سیّاح کے سفرنامے کو ملحوظ خاطر رکھیے۔ جب وہ شمالی افریقہ گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کی عورتیں خاص قسم کا لباس پہنتی ہیں۔ مخصوص انداز میں سنگھار کرتی ہیں ان کے رہن سہن کا خاص طریقہ ہے۔ وہاں کے مرد بھی اپنے مخصوص انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے شہروں کی ساخت اور ان کا فنِ تعمیر بھی جداگانہ طرز کا ہے۔ ان کے ادب اور شہروں کی تعمیر کا انداز بھی مخصوص نوعیت کا ہے۔ اس کے بعد وہ چاڈ پہنچتا ہے۔ جہاں کی ہر چیز اسے مختلف نظر آتی ہے یہاں سے وہ بغداد آتا ہے اس جگہ کی بھی ہر چیز اسے بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سے وہ شہر مکّہ کی جانب روانہ ہوتا ہے یہاں بھی ہر چیز کا انداز مختلف ہے۔ جب وہ نیشاپور پہنچتا ہے تو اسے یہاں کی بھی ہر چیز بدلی ہوئی لگتی ہے۔ اور جب وہ شہر طوس میں وارد ہوا تو اسے لگا کہ یہاں کی ہر چیز میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ نیز یہ بات ہمارے ذہنوں میں ابھی تک محفوظ ہے کہ ہر تحفہ کسی خاص جگہ سے منسوب و مخصوص ہوتا ہے۔ چنانچہ ایران کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسی خاص چیز تیار کی جاتی ہے جو قسم و جنس کے اعتبار سے دوسری جگہ نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ یہاں کی ہر ریاست کو کسی خاص میدان میں وہ تخصص و امتیاز حاصل ہے کہ دوسرے ممالک اس میدان میں ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشینی نظام کے دور سے قبل یہاں کے لوگ آزادانہ طور پر تجربات، غور و فکر اور چیزوں کا انتخاب کر سکتے تھے۔ ان کے ذوق و مزاج نیز غیر معمولی ذہانت کی متنوع سطح پر نشو و نما ہوتی رہتی تھی۔ اور اسی کا نام اصالت ہے۔ مثال کے طور پر کرمان کے قالین کو ہی لے لیجیے۔ کرمانی قالین میں اس کی اصالت برقرار ہے۔ اصفہان کی نقاشی (MINIATURE WORK) اور کاشی کاری (TILE WORK) میں اصالت پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہی شعر و ادب، فلسفہ، دینی افکار و خیالات، مذہبی عبادات و رسومات، جمالیات، علوم و فنون لباس کی وضع قطع وغیرہ مختلف سمتوں میں مختلف طریقوں سے نمایاں ہو کر نشو و نما پاتے تھے۔

لیکن اس کے برعکس مشینی نظام کا انحصار ایسی کارگاہ پر ہے کہ جب وہ ضروریات سے زیادہ مال تیار کرنے پر آتی ہے تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے اس کام سے باز رہے۔ مشین کو کام کرنے سے ہرگز نہیں روکا جا سکتا۔ وہ جو بھی مال تیار کرتی ہے اس میں اس کثرت سے اضافہ ہوتا رہتا ہے کہ وہ بہر صورت ملک کی منڈیوں کے مصرف سے کہیں زیادہ تجاوز کر جاتا ہے۔ اور اس طرح تمام ہی انسان اس بات کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک ہی قسم کے مال کا استعمال کریں۔ یا بالفاظِ دیگر تمام انسانوں کو ذوق کے اعتبار سے ایک ہی قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب میں مشہد کے کسی مدرسے، روشن فکر افراد کے ادارے یا دانشکدے میں وارد ہوتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی تہران کے مدارس اور اداروں کی ہی طرح ہیں۔ تہران بالکل اصفہان جیسا ہے۔ اصفہان بالکل (حیدر آباد) دکن کی مانند، حیدر آباد دکن کلکتہ (بنگال) جیسا کلکتہ استنبول کی طرح کا، استنبول پیرس کی مانند، اور پیرس ہارڈ ورڈ کی طرز کا، یہاں کے لوگوں کے لباس ایک ہی جیسے ہیں شہروں کی ساخت بھی ایک ہی طرح کی ہے، کام کرنے کے ڈھنگ، طرز زندگی اور گھروں کی آرائش زیبائش بھی ایک ہی قسم کی ہے۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہاں کے لوگوں میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کا فقدان ہے اب کوئی بھی اصفہانی، مشہدی، کرمانی تہرانی، ہندوستانی، ترک، عرب، چینی اور جاپانی اپنے فطری ذوق و ہنر کو بروئے کار نہیں لاتا۔ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ ساکت و جامد ہے اور اس نے ان قالبوں کو قبول کر لیا ہے جو مشینی نظام نے اس کے استعمال کے لیے فراہم کئے ہیں۔

انسانیت اصولِ ارتقا نیز اپنی گہری اور مختلف الابعاد میں پھیلی ہوئی متنوع تخلیقی و تعمیری صلاحیتوں کو ایک دم نیست و نابود کئے دے رہی ہے۔ وہ اپنے تنوع کو تباہ و برباد کر کے خود کو ان صاف ستھرے سانچوں میں ڈھال لینا چاہتی ہے جنہیں ہم آج ریاضی کی ۴×۶ کی شکلوں پر مشتمل ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ بقول مارکوس آج کے دور کا انسان ایک ہی رُخ کا ہو کر رہ گیا ہے۔

انسانی وجود:۔ انسان دراصل دو نصف کا مجموعہ ہے۔ اس کا نصف اوزاروں پر مشتمل ہے اور نصف انسانیت پر۔ اس کے، ہاتھ پاؤں، دانت اس کی آنکھیں، زبان اور انگلیاں اس کا نصفِ وجود ہیں۔ اور ان سے وہ اوزاروں کا کام لیتا ہے۔ لیکن اس مجموعے کا نام انسان نہیں۔ چنانچہ جب میں قلم کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیتا ہوں تو میرے نصف وجود کا ایک حصہ یعنی میری انگلیاں اپنے فرض کو پورا کرتی ہیں۔ اسی طرح عینک جسے میں استعمال کرتا ہوں اس کی حیثیت بھی میرے لیے نصف اوزار کی ہے یعنی میری آنکھوں کا تتمہ بن جاتی ہے چنانچہ بیلچے کے ذریعے میں اپنے ہاتھ کو کام میں مشغول رکھ سکتا ہوں اور اسی طرح جوتے کے ذریعے میں اپنے پیر سے اپنے کام کو جاری رکھ سکتا ہوں

لیکن مشین نہ صرف انسان سے بے نیاز ہو جاتی ہے بلکہ وہ اس کے نصف انسانی وجود پر بھی نفرت اور اس میں دخل اندازی شروع کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر عکاسی (PHOTOGRAPHY) اور نقاشی (PAINTING) کو ہی لے لیجے۔ نقاشی موقلم اور رنگ و روغن سے علیحدہ ایک شے ہے۔ موقلم اور رنگ وغیرہ اس نصف انسان کا بقیہ ہیں جو اوزاروں پر مشتمل ہے۔ پہلے انسان اپنی انگلیوں سے نقاشی کرتا تھا لیکن اب موقلم، کے ذریعے وہ بہتر طور پر اسی کو انجام دے سکتا ہے۔ گویا اس طریقے سے اس کی انگلیوں نے ترقی کی ہے۔ لیکن فنِ نقاشی بذات خود نصف انسان کی انسانیت کا مظہر ہے لیکن جب نقاشی کی جگہ عکاسی لے لیتی ہے تو وہ نصف انسان کے اوزاری وجود کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ نصف انسانیت پر مشتمل انسان کا بقیہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح جب میں پنسل سے اپنا حساب لکھتا ہوں تو اس کے ذریعے میری انگلیوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن حساب گر مشین (CALCULATOR) یا ایسی ہی دوسری بڑی بڑی مشینیں جب عالم وجود میں آجاتی ہیں تو ..... وہ انسانیت پر مشتمل انسان کا بقیہ بن جاتی ہے۔ اب میرے سوچنے کا عمل موقوف ہوا اور اس کام کو مشین نے انجام دینا شروع کر دیا۔ مشین کا یہ تفرقہ انسانی وجود پر اس حد تک ہو جاتا ہے کہ انسان کیلئے یہ خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ کہیں وہ مفلوج ہو کر نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ ندامت و جدّت پسندی کا جذبہ بالکل مفقود ہو کر رہ جاتا ہے۔ بطور مثال مشینِ تحریر (TYPE WRITER) کو ہی لے لیجئے۔ وہ ایک خاص طرز کا خط ہے جو ایران کی تین کروڑ نفوس کی آبادی پر مسلّط کر دیا گیا ہے۔ درحالیکہ مشین تحریر سے قبل ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق خط کی اقسام و تنوع میں اس کی زیبائش و آرائش کی غرض سے اپنے تفنّن طبع کا اظہار کیا کرتا تھا اور اس میدان میں کسی نئی چیز کا اختراع و انکشاف بھی کیا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر یہی چھوٹی چھوٹی باتیں آگے چل کر بہت بڑے اور اہم مسائل بن جاتی ہیں۔

موجودہ دور کے ماہر عمرانیات (SOCIOLOGIST) نے خود کو اعداد و شمار کے حوالے کر دیا ہے۔ اعداد و شمار کو عمرانیات میں اور خصوصاً ایرانی معاشرے پر زبردستی مسلّط کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ماہر عمرانیات کسی گاؤں میں وارد ہوتا ہے تو اس کی نظر وہاں پر بسنے والے انسانوں پر نہیں رہتی بلکہ وہ کچھ سوالات لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ وہاں کے لوگوں کے بارے میں نہ آنکھ سے دیکھتا ہے اور نہ ذہن سے سوچتا ہے۔ وہ تو بس جوابات کا منتظر رہتا ہے۔ اور جب اسے جوابات مل جاتے ہیں تو وہ انہیں مشین کے حوالے کر دیتا ہے اور انہی کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتا ہے۔ انہی کے مطابق معاشرے کے متعلق اپنے فیصلے صادر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرز عمل سے انسان کا وجود مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے اور کسی بھی کام میں اس کا کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ ●●